اداریہ

بنیاد کا یہ شمارہ اس وقت شایع ہورہا ہے، جب کووڈ-۱۹ کی وبا اپنے آخری دموں پر ہے۔ دنیا اپنے معمولات کی طرف لوٹنے لگی ہے، یہ الگ بات ہے کہ اب یہ پہلے جیسی دنیا نہیں ہے۔ ہم نے یہ مناسب سمجھا کہ اس بار اداریے کا موضوع وبا، سماج اور ادب کے تعلق کو بنایا جائے۔

دنیا کبھی دہائیوں تک کروٹ نہیں لیتی اور کبھی ہفتوں میں کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔ لینن (Vladimir Lenin۔ ۱۸۷۰ء-۱۹۲۴ء) سے منسوب یہ مقولہ کورونا وائرس کی موجودہ وبا کے ہاتھوں دنیا کے بدلنے پر صادق آتا ہے۔ دسمبر ۲۰۱۹ء میں، چین کے شہر ووہان (Wuhan) میں کورونا وائرس کے اوّلین مریضوں کی تشخیص ہوئی اور اگلے چند ہفتوں میں، دنیا اس وائرس کے ہاتھوں تیزی سے بدلنے لگی۔ تتلی کے پروں سے طوفان برپا ہونے کی تمثیل حقیقت بننے لگی۔ گزشتہ صدی کے اواخر سے دنیا کا نقشہ عالمگیریت اور صارفیت نے تشکیل دیا ہے۔ پہلی زد انھی پر پڑی۔ بین الاقوامی آمدورفت بند یا محدود ہوئی۔ ملکوں نے اپنے فضائی اور زمینی راستے بند کیے۔ شہر مقفل ہوئے۔ لوگ گھروں میں مقید ہوکر رہ گئے اور ایک دوسرے سے سماجی فاصلہ اختیار کرنے لگے۔ ان کے روزمرہ امور کا انحصار ڈیجیٹل طور طریقوں پر بڑھ گیا۔ سرمایہ داریت کی جنون آمیز رفتار سے چلنے والی مشین، ایک جھٹکے سے جیسے رک گئی، تاہم جلد ہی اس نے خود کو ''ڈیجیٹل گیئر'' پر منتقل کر لیا۔ اب، جون ۲۰۲۱ء میں دنیا وہ نہیں ہے جو ڈیڑھ سال پہلے تھی۔ دنیا بھر کے تقریباً اڑتیس لاکھ لوگوں کی جان لینے کے بعد کورونا وبا کی شدت کم ہوچکی ہے۔ اس وقت ویکسین کی مدد سے دنیا کو محفوظ بنانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ دنیا بھر کی سیاست، معیشت، ثقافت، ادب اور ان کے ساتھ ساتھ انسانی نفسیات اور سماجی روّیوں پر اس وبا نے غیرمعمولی اثرات مرتب کیے ہیں۔ فرید زکریا نے اپنی تازہ کتاب *Ten Lessons For a Post-Pandemic World* میں لکھا ہے: ''اس کا امکان ہے کہ حساب کتاب کے بعد پتا چلے کہ اس وائرس کے ہاتھوں بنی نوع انسان کو معاشی، سیاسی اور سماجی طور پر اس سے کہیں بڑھ کر نقصان ہوا ہے، جو اسے دوسری عالمی جنگ میں ہوا تھا۔'' بلاشبہ اس وبا میں اموات، عالمی جنگوں سے کہیں کم ہیں اور پہلی وباؤں سے بھی کہیں کم۔ ایک صدی پہلے کے ہسپانوی فلو میں پانچ کروڑ انسان لقمۂ اجل بنے تھے۔ دونوں عالمی جنگیں طاقت و سرمائے میں لامتناہی اضافے کی خاطر لڑی گئیں اور دنیا کا ایک نیا نقشہ ترتیب دینے کی غرض بھی شامل تھی۔ سب

جنگیں تلوار، بارود اور نظریے سے لڑی جاتی ہیں۔ ان کا اتحاد کتنا مہلک ہوتا ہے، جنگوں کی تاریخ پر سرسری نظر ڈالنے سے نظر آجاتا ہے۔

ہر چند موجودہ وبا کے بارے میں وثوق سے کہنا مشکل ہے کہ یہ فطری ہے یا انسانی غلطی کا نتیجہ ہے یا باقاعدہ کسی منصوبے کا حصہ، مگر یہ بات اعتماد سے کہی جاسکتی ہے کہ اس کے خلاف جو جنگ لڑی گئی ہے اور ابھی جاری ہے، اس میں جنگ کے کچھ روایتی طور طریقے ضرور شامل ہیں۔ جیسے حادثات کو سیاسی و معاشی مواقع میں بدلنا اور دنیا کو اس طریقے سے ترتیب دینا جو عالمی مقتدرہ کے مفاد کے مطابق ہو۔ ۱۹۱۸ء میں جب انفلوئنزا کی وبا پھیلی تھی تو پہلی عالمی جنگ کے سبب، اس کی خبروں پر پابندی تھی۔ سپین پہلا ملک تھا، جس نے اس مہلک ترین وبا کی خبروں کو نشر کیا۔ یہیں سے اس فلو سے سپین کا نام نتھی ہوا، جس کے خلاف سپین نے احتجاج کیا کہ اس کی سرزمین اور لوگوں کو بد نام کیا جارہا ہے۔ یہ ایک طرح سے عالمی مقتدرہ کی طرف سے سپین کو جنگ کے عائدہ کردہ ''اصول'' کو توڑنے کی سزا تھی۔ کورونا وبا کے دوران میں بھی سب ملکوں نے تالا بندی کی مدد سے، جہاں اپنے شہریوں کی زندگیوں کو محفوظ بنانے کا اقدام کیا، وہیں ان کی نقل وحرکت پر اپنے مطلق اختیار کا مظاہرہ بھی کیا۔ تالا بندی کے یقیناً، سائنسی طبی اسباب تھے مگر سیاسی علامتی اثرات بھی معمولی نہیں تھے۔ میشل فوکو (Michel Foucault۔۱۹۲۶ء-۱۹۸۴ء) کا Effect Panopticon کا تصور اپنی عمل صورت میں نظر آنے لگا، جس کے مطابق طاقت بہ یک وقت دیدہ اور نا قابل تصدیق ہوتی ہے؛ آپ طاقت کو ہمہ وقت خود پر نگران پاتے ہیں مگر اس کی ٹھیک ٹھیک تصدیق نہیں کرسکتے۔ تالا بندی کے نتیجے میں دنیا پہلے سے زیادہ سوشل میڈیا پر فعال ہوئی۔ آن لائن کاروبار کا حجم کئی گنا بڑھ گیا۔ تعلیم و تدریس، ادبی فیسٹول، کانفرنسیں، سرکاری وغیر سرکاری اجلاس آن لائن ہونے لگے تو انسانوں کی ہر سرگرمی گویا نگرانی کے اس نظام میں آگئی جسے یووال نوح ہراری (Yuval Noah Harari۔پ:۱۹۷۶ء) نے نگرانی کے بالائی جلد اور زیریں جلد (Over-the-skin and under-the-skin) نظام کا نام دیا ہے۔

ارون دھتی رائے (Arundhati Roy۔پ:۱۹۶۱ء) نے گزشتہ برس شایع ہونے والے اپنے مضامین کے مجموعے *Azadi* کے آخری مضمون کا عنوان ''The Pandemic is a Portal'' رکھا ہے۔ اس میں وہ وبا کے ابتدائی مہینوں میں ہندوستان کی دائیں بازو کی قوم پرستانہ سیاست کے تجزیے کا اختتام اس خیال پر کرتی ہیں کہ ''تاریخی طور پر تمام وباؤں نے، انسانوں کو ماضی سے منقطع ہونے اور دنیا کا ایک نیا تخیل قائم کرنے پر مجبور کیا ہے۔ وبا ایک باب (portal) ہے، پرانی اور نئی دنیا کے درمیان۔'' اصل مسئلہ یہ سمجھنا ہے کہ وبا کے بعد کی دنیا کے خدوخال کیا ہوں گے؟ کیا ہم واقعی وبا سے پہلے کی دنیا

سے یکسر منقطع ہو گئے ہیں اور یہ سلسلہ مزید آگے بڑھے گا ؟ کیا وبا کے بعد کی دنیا سب انسانوں کے لیے بہتری کا امکان رکھتی ہے یا صرف مقامی و عالمی اشرافیہ کے لیے؟ ہمارے ادیب اس دنیا سے متعلق کیا سوچتے ہیں اور وبا کے دوران اور بعد کے زمانے کو اپنی تخلیقات میں کس طور پیش کر رہے ہیں ؟ وبا پہلے بھی ادب کا موضوع بنتی رہی ہے، کیا اب بھی اسی انداز میں اسے موضوع بنایا جارہا ہے یا اب ادب کی نظر میں وبا کی معنویت بدل گئی ہے؟ کیا ہماری جامعات کے اساتذہ اور محققین، مابعد وبا دنیا میں تعلیم، زبانوں، ادبیات کے کسی نئے اور انسانی حوالے سے زیادہ مؤثر کردار کے بارے میں سنجیدگی سے غور کر رہے ہیں؟ یہ سب سوالات اہم ہیں، جن پر تفصیل سے لکھا جانا چاہیے اور ہم امید رکھتے ہیں کہ پاکستانی سماجی ماہرین، اساتذہ اور پاکستان کی سب زبانوں کے ادیب ان سوالات پر مسلسل لکھیں گے۔ اردو میں کئی ادیبوں نے کوورنا وبا پر خاصا لکھا، جس کے ایک حصے کا جائزہ اس شمارے میں لیا گیا ہے۔ آصف فرخی مرحوم (۱۹۵۹ء-۲۰۲۰ء) نے اپنے انتقال (یکم جون ۲۰۲۰ء) سے پہلے وبا پر دنیازاد کا خصوصی شمارہ مرتب کیا تھا، جسے ان کی صاحبزادی نے شایع کر دیا ہے۔ یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ یکسر نئی صورتِ حال ہمارے فہم کے لیے چیلنج ہوتی ہے۔اس چیلنج سے عہدہ برا ہونے کے لیے ہم ماضی کی مماثل صورتِ حال سے مدد لے سکتے ہیں۔اسی اصول کے تحت ہم یہاں چند باتیں اس ضمن میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ اس سے پہلے ادب نے وبا کو کس زاویے اور تناظر میں پیش کیا ہے۔

ہم نے یہ دیکھا کہ وبا کے دنوں میں قارئین کی دل چسپی وبا سے متعلق لکھے گئے ادب سے بڑھ گئی۔ دراصل ہم ایک نئی قسم کی نفسی و داخلی صورتِ حال کی زد پر آئے۔ ہماری سماجی زندگی ختم ہوکر رہ گئی۔ ہم اپنے گیجٹس کے ساتھ گھروں اور گھروں کے کونوں میں سمٹ کر رہ گئے۔ ہم نے ایک طرف طویل فرصت، تنہائی اور بوریت کا سامنا کیا، دوسری طرف خود کو اور اپنے پیاروں کے کھونے کا حقیقی خوف ہمارے دلوں میں بیٹھ گیا۔ کئی لوگوں نے واقعی اپنے پیاروں کو ہمیشہ کے لیے کھویا بھی۔ یہاں تک کہ دنیا کے خاتمے سے متعلق بھی افواہیں گردش کرنے لگیں۔ یہ صورتِ حال، نفسی و وجودی سطح پر بحرانی تھی، جس نے ہمیں وبا پر لکھے ہوئے ادب کی طرف متوجہ کیا۔ ہم نے یہ جاننے کی کوشش کی کہ اس سے پہلے وباؤں کو ادب نے کس طور، کس ڈھنگ، کس تناظر میں پیش کیا ہے ؟ تب وبا کی طرف لوگوں کے رویے کیا تھے؟ جس دہشت انگیز صورتِ حال کا سامنا ہم کر رہے ہیں، پہلوں نے اس کا سامنا کیوں کر کیا؟ چناں چہ وبا سے متعلق عالمی اور مقامی ناول خاص طور پر پڑھے گئے اور ان پر کچھ لکھا بھی گیا۔ وبا کے دنوں میں جن عالمی ناولوں کو مسلسل پڑھا گیا، ان میں ڈینئل ڈیفو (Daniel Defoe۔وفات:۱۷۳۱ء) کا *A Journal of the Plague Year* (۱۷۲۲ء)، میری شیلے (Mary Shelley۔۱۷۹۷ء-۱۸۵۱ء) کا ناول

The Last Man (۱۸۲۶ء)، جیک لنڈن (Jack London۔۱۸۷۶ء-۱۹۱۶ء) کا *The Scarlet Plague* (۱۹۱۵ء)، کیتھرین این پورٹر (Katherine Anne Porter۔۱۸۹۰ء-۱۹۸۰ء) کا *Pale Horse, Pale Rider* (۱۹۳۹ء)، کامیو (Albert Camus۔ ۱۹۱۳ء-۱۹۶۰ء) کا *The Plague* (۱۹۴۷ء) اور گیبریئل گارشیا مارکیز (Gabriel García Márquez۔۱۹۲۷ء-۲۰۱۴ء) کا ''وبا کے دنوں میں محبت'' (۱۹۸۵ء)، کم سٹینلے رابنسن (Kim Stanley Robinson۔پ:۱۹۵۲ء) کا *The Years of Rice and Salt* (۲۰۰۲ء) اور دیگر متعدد ناول شامل ہیں۔ وبا سے متعلق مغربی ناولوں میں وبا کے دنوں میں انفرادی، سماجی اور حکومتی رویوں کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ انھیں پڑھتے ہوئے *Illness as Metaphor* (۱۹۷۸ء) کی مصنفہ سوسن سونٹاگ (Susan Sontag۔۱۹۳۳ء-۲۰۰۴ء) کی یہ بات بار بار یاد آتی ہے کہ بیماری، استعارہ بنتی ہے۔ بیماری کو سزا یا سازش سمجھنا بھی اسے استعاراتی حدود میں لے جاتا ہے۔ یعنی اسے اخلاقی، مابعد الطبیعیاتی اور سیاسی معانی کا حامل ثابت کرتا ہے۔ یہ موضوع وبا سے متعلق اردو ادب میں بھی ملتا ہے، مگر وبا سے متعلق مغربی فکشن کی ایک خصوصیت ایسی ہے جو اسی سے مخصوص ہے۔ وہ یہ کہ وبا سے متعلق اکثر ناول ڈسٹوپیائی ہیں۔ ان میں دنیا کے خاتمے کی فنتاسی ملتی ہے۔ ان میں محض انتہائی حقیر وائرس کے ہاتھوں دنیا کی مکمل تباہی کا خوف ہی کارفرما نہیں بلکہ جدید تہذیب سے متعلق ان یوٹوپیائی تصورات کو رڈ کرنے کی کوشش بھی ہے جو اس تہذیب کے تضادات پر پردہ ڈالتے ہیں۔ مارکیز کا ناول قدرے مختلف ہے۔ اس میں اگرچہ دنیا کے خاتمے کا تصور نہیں مگر وبا اور بیماری کے استعاراتی معانی اس میں بھی ہیں۔ ڈاکٹر اربینو مغربی جدیدیت کا نمائندہ ہے جس نے ہیضے کے خاتمے کے لیے اپنی زندگی وقف کی ہوئی ہے؛ وہ اس امر کا استعاراتی نمائندہ ہے کہ مغربی جدیدیت اور سائنس ہی وباؤں کے خاتمے میں مئوثر ہے۔ نیز خود ہیضے کو بیماری اور اس پر جوش محبت کے معانی میں لیا گیا ہے جو فرمینا اور فلورینٹیو میں ان کے بڑھاپے میں بھی برقرار رہتی ہے۔

اسی وبا کے دوران میں اردو ادیبوں کو خود اپنی ادبی روایت میں وبا سے متعلق لکھے گئے ادب کی تلاش ہوئی۔ کوارنٹین کا لفظ جب عام ہوا تو راجندر سنگھ بیدی (۱۹۱۵ء-۱۹۸۴ء) کے پہلے مجموعے دانہ و دام (۱۹۳۶ء) کا افسانہ ''کوارنٹین'' ''دریافت'' ہوا۔ اس میں نو عیسائی ولیم بھاگو، جو خاکروب ہے، وہ اپنی صحت و زندگی کی پروا کیے بغیر کوارنٹین میں موجود مریضوں کی خدمت کرتا ہے۔ وبا نے اسے خودغرض نہیں، بے غرض اور بے خوف بنایا ہے۔ غالب (۱۷۹۷ء-۱۸۶۷ء) کے اردو خطوط پڑھے گئے، جن میں وبا کا ذکر ہے۔ غالب نے دوستوں کے نام خطوط میں دہلی میں ہیضے کی وبا کو آئرنی کے انداز میں پیش کیا۔ ''ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا۔ ایک فتنہ انہدام مکانات کا، ایک آفت وبا کی۔'' نیز ''بھائی کیسی وبا؟

جب چھیاسٹھ برس کے بڈھے اور چونسٹھ برس کی بڑھیا کو نہ مار سکی تو تف بر ایں وبا۔'' اس کے بعد نذیر احمد (۱۸۳۰ء-۱۹۱۲ء) کا توبتہ النصوح (۱۸۷۳ء) دل چسپی سے پڑھا گیا، جس میں نصوح ہیضہ کرتا ہے اور اس کے بعد اپنے گھر میں اصلاح کا آغاز کرتا ہے اور یہ اصلاح، انگریز استعمار کی طرف سے ہندوستانیوں کو مہذب بنانے کے اس مشن (civilising mission) کے مثل ہے، جس کا مقصد اپنی ناجائز حکومت کو جائز بنانا تھا۔ نصوح کا ہیضہ نئی اور پرانی دنیا کے بیچ، ارون دھتی رائے کے لفظوں میں ''پورٹل'' ہے۔ عالمی ادب کی مانند، اردو ادب میں بھی یہ سوال ملتا ہے کہ وبائیں فطری ہیں یا انسانی اعمال کا نتیجہ؟ نیز کیا یہ خدا کے احکامات کی نافرمانی کی سزا ہیں، حادثاتی ہیں یا صاحبان اقتدار کی طرف سے سازش ہیں؟ چوں کہ وائرس عام نظر سے اوجھل رہتے اور صرف ماہرین ہی کو نظر آتے ہیں، اس لیے ان سے پیدا ہونے والی بیماریوں کو ورائے حس و عقل دنیا سے منسوب کرنا عام ہے۔ دوسری طرف وباؤں کو سیاسی طور پر استعمال کرنے اور انھیں اخلاقی تربیت کا ذریعہ بنانے کے موضوعات بھی ادب میں ملتے ہیں۔ توبتہ النصوح میں ہیضہ اخلاقی تربیت کا ذریعہ ہے۔ البتہ اردو میں کوئی ناول ایسا نہیں لکھا گیا جس میں کسی وبا کو پوری دنیا کو ختم کرتے دکھایا گیا ہو۔ یہاں ہمارا فکشن مغربی فکشن سے جدا رخ اختیار کرتا ہے۔

وبا کچھ غیر معروف ناولوں اور تحریروں کو بھی سامنے لے آئی۔ ان میں فخر النسا نادر جہاں کا افسانہ ''نادر جہاں'' (۱۹۰۱ء) شامل ہے۔ کم سنی کی شادی کے موضوع پر اس ناول میں لال بخار کا ضمنی بیان ہے، اور وہ بھی مریض کی جسمانی حالت کا۔ پطرس بخاری (۱۸۹۸ء-۱۹۵۸ء) نے ''مکھیوں کا بادشاہ'' کے عنوان سے ایک کہانی ترجمہ کی جو سقراط (۴۷۰ ق م-۳۹۹ ق م) کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ اگرچہ یہ بچوں کو صفائی کی اہمیت بتانے کا مدعا رکھتی ہے، مگر اس میں ایک طرف وبا کو انسانی تکبر و عیش پسندی کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے اور دوسری طرف مکھی جیسی حقیر مخلوق کو غیر معمولی تخریبی قوت کا حامل قرار دیا گیا ہے جو بادشاہتوں کے خاتمے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ایک وبا یا صحیح لفظوں میں ایک وائرس، ہماری دنیا کے نظم کو برہم کرنے اور جس عظیم الشان تہذیب پر انسان فخر کرتا ہے، اسے زمیں بوس کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ ایک بے گھر، بے وطن، مکمل طور پر طفیلیہ، خود کو سب مخلوقات میں اشرف سمجھنے والوں اور واقعی ستاروں پر کمندیں ڈالنے والوں کو پل بھر میں تہ خاک پہنچا سکتا ہے۔ یہ تضاد اور یہ پیراڈاکس، سب وباؤں میں نظر آتا ہے۔

امریکی مؤرخ ولیم ایچ میک نیل (William H. McNeill۔۱۹۱۷ء-۲۰۱۶ء) نے اپنی کتاب *Plagues and Peoples* (۱۹۷۶ء) میں وباؤں کے استعماری رخ کی نشان دہی کی ہے۔ میکسیکو کے لاکھوں لوگوں کو سپین کے چھ سو سے کم

افراد نے کیسے اپنا غلام بنا لیا؟ یہ سوال میک نیل کے لیے پریشان کن تھا۔ اسی نوع کا سوال سجاد ظہیر (۱۸۹۹ء-۱۹۷۳ء) نے اپنے ناولٹ لندن کی ایک رات (۱۹۳۸ء) میں اٹھایا تھا کہ کیسے چار ہزار گوروں نے پینتیس کروڑ ہندوستانیوں کو اپنا محکوم بنایا؟ میک نیل بارود، بندوقوں، گھوڑوں نیز مقامی باشندوں میں میر جعفر و صادق (وفات بالترتیب ۱۷۶۵ء اور ۱۷۹۹ء) جیسے لوگوں کی حمایت مل جانے کو میکسیکو کے سقوط کے قابل قبول اسباب میں شمار نہیں کرتا۔ بڑا سبب یہ تھا کہ ہسپانوی ہرنان کورٹز (Hernán Cortés۔ ۱۴۸۵ء-۱۵۴۷ء) اپنے ساتھ چیچک اور دوسری وبائیں لایا، جن سے مقامی انڈینز کی نوے فی صد تک آبادی کا صفایا ہوگیا۔ جو بچ رہے، وہ یورپ سے لائی گئی وبا کے نفسیاتی اثرات کا شکار ہوئے۔ انھوں نے دیکھا کہ چیچک نے صرف مقامی انڈینز کا خاتمہ کیا، جب کہ یورپی ہسپانوی محفوظ رہے۔ نئی قسم کی وبا سے میکسیکو کے باشندوں کا تعارف، اس وبا کے مہلک ترین اثرات کے طور پر ہوا۔ چناں چہ انھوں نے وبا کے امتیازی سلوک کا سبب مافوق لافطرت قوتوں میں تلاش کیا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ان کے خدا انھیں نہیں بچا سکے، مگر ہسپانویوں کے خدا نے انھیں محفوظ رکھا۔ انھوں نے عیسائیت قبول کر لی۔ سجاد ظہیر نے سوال تو اہم اٹھایا اور اس پر حیرت کا بھی اظہار کیا مگر جواب ہمیں اس سے پہلے اکبر الٰہ آبادی (۱۸۴۶ء-۱۹۲۱ء) کے یہاں ملتا ہے۔

طاعون سے کیوں ہے اتنی وحشت اکبر
یہ تو ایک ٹیکس ہے اس آبادی پر

ایسا ٹیکس جس میں روپیہ نہیں، آدمی کی جان جاتی ہے۔ آبادی کم ہوتی ہے اور قابو میں رہتی ہے۔ اب یہ راز نہیں کہ نوآبادیاتی عہد کی وبائیں اور قحط فطری کم اور انسان ساختہ زیادہ تھیں، جن کا مقصد موت، بربادی، ویرانی اور ناتوانی کو مسلط رکھنا تھا اور آبادی کو ایک حد میں بھی۔ ایسی دنیا کو محکوم رکھنا اور ان کی سماجی وذہنی دنیاؤں کو استعماری منشا کے مطابق ڈھالنا آسان ہوتا ہے۔ ششی تھرور (پ:۱۹۵۶ء) نے *An Era of Darkness* (۲۰۱۶ء) میں لکھا ہے کہ ساڑھے تین کروڑ ہندوستانی نوآبادیاتی عہد میں قحط کے سبب جان سے گئے۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ ششی تھرور سے پہلے، میلا رام وفا (۱۸۹۵ء-۱۹۸۰ء) نظم ''اے فرنگی'' میں وبا اور انگریزی استعمار کے تعلق پر لکھ چکے تھے۔

اے فرنگی کبھی سوچا ہے یہ دل میں تو نے
اور یہ سوچ کے کچھ تجھ کو حیا بھی آئی
نا مبارک تھا بہت ہند میں آنا تیرا
قحط آیا ترے ہمراہ وبا بھی آئی

میلا رام وفا کو اس نظم کے نتیجے میں انگریزی سرکار کی طرف سے مقدمے کا سامنا کرنا پڑا اور دو سال قید سخت کی سزا جھیلنا پڑی۔ جوش (۱۸۹۸ء-۱۹۸۲ء) نے اگرچہ نظم ''ضعیفہ'' میں ایک ضعیف عورت کی بے بسی وتنہائی کو پیش کیا ہے مگر اس نظم کا تناظر بہ یک وقت طاعون کی وبا، استعماریت اور ہندوستانی غلامی ہے۔ کرشن چندر (۱۹۱۴ء-۱۹۷۷ء) کا افسانہ ''ان داتا'' (۱۹۴۴ء) قحط (بنگال)، بیماری اور استعمار کے باہمی رشتے کو طنز وآئرنی کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ افسانے کا راوی ایک غیر ملکی قونصل ہے، جس کے ضمیر میں کانٹا ہے۔ وہ کہتا ہے: ''در اصل ایشیائی بیماریوں کی نوعیت مغربی امراض سے مختلف ہے۔ بہت مختلف ہے، یہ اختلاف اس مفروضے کا بدیہی ثبوت ہے کہ ایشیائی اور مغربی دو مختلف انسان ہیں۔'' نو آبادیاتی عہد دونوں کے فرق پر مسلسل مہر تصدیق ثبت کرتا ہے اور یہ افسانہ بھی۔ مثلاً: ''ہندوستانیوں اور چوہوں کی شرح پیدائش دنیا میں سب سے زیادہ ہے اور اکثر حالتوں میں ان دونوں میں امتیاز کرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ وہ جتنی جلدی پیدا ہوتے ہیں، اتنی جلدی مر جاتے ہیں۔ اگر چوہوں کو پلیگ ہوتی ہے تو ہندوستانیوں کو سوکھیا بلکہ عموماً پلیگ اور سوکھیا دونوں لاحق ہوجاتی ہیں۔ بہر حال جب تک چوہے اپنے بل میں رہیں اور دنیا کو پریشان نہ کریں، ہمیں ان کے نجی معاملات میں دخل دینے کا کوئی حق نہیں۔'' اردو ادیب یہ سمجھ رہے تھے کہ قحط، بیماری، وبائیں چوہوں جیسے انسانوں کو ان کے بل میں رکھنے کا وسیلہ ہیں۔

قرۃ العین حیدر (۱۹۲۷ء-۲۰۰۷ء) کے مجموعے پت جھڑ کی آواز (۱۹۶۵ء) میں افسانہ ''ایک مکالمہ'' شامل ہے، جس میں الف اور ب معاصر دنیا کی حالت پر باہم گفتگو کرتے ہیں۔ اس کا آغاز ہی وبا کے ذکر سے ہوتا ہے۔ ب کہتا ہے کہ ''سنا ہے بڑی سخت وبا پھیلی ہے۔'' اس کے جواب میں الف جو کچھ کہتا ہے، وہی باتیں ہمیں تمام نو آبادیاتی اور آمرانہ حکومتوں کے یہاں ملتی ہیں جو وبا سمیت ہر صورتِ حال کو اپنے لیے سیاسی موقع میں تبدیل کرتی ہیں۔ الف کہتا ہے ''وبا پھیلی ہے اور لوگ مرتے ہیں۔ اگر نہ مریں تو دنیا کی آبادی اور بڑھ جائے اور مزید گڑ بڑ پھیلے۔'' ب جب یہ کہتا ہے کہ کیا پہلے گڑ بڑ کم ہے تو الف دوسری بات کہتا ہے: ''خدا سے امید ہے کہ پچاس لاکھ تو مر ہی جائیں گے۔'' ب اس پر حیرت کا اظہار کرتا ہے تو الف کہتا ہے کہ ''دنیا بھری پڑی ہے، خصوصاً ایشیا میں، اس لیے پچاس لاکھ کے مرنے سے فرق نہیں پڑے گا۔'' ہم نے کورونا وبا کے دوران میں بھی اس نوع کی باتیں سنیں۔ محمد مجیب (۱۹۰۲ء-۱۹۸۵ء) نے اپنے افسانے ''کیمیا گر'' (جس پر اپنے افسانوی مجموعے کا نام بھی رکھا ہے، مطبوعہ ۱۹۵۹ء) میں وبا کو بہ یک وقت قومی، اخلاقی، انسانی تناظر میں دیکھا ہے۔ کسی حد تک بیدی کے ''کوارنٹین'' کی مانند۔ ''کیمیا گر'' کا حکیم مسیح، ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے وطن ترکستان کو یاد کرتا ہے۔ وہ اپنے سماجی تعلقات میں ہندوؤں سے دور رہتا ہے۔ جب طاعون کی وبا آتی ہے تو وہ اپنے اہل خانہ سمیت شہر چھوڑ دیتا ہے۔ تاہم بہ طور

حکیم اپنی ذمہ داری کے اخلاقی مخمصے میں مسلسل گرفتار رہتا ہے۔ پہلی ہی رات وہ خواب میں اس کیمیا گر کو دیکھتا ہے، جس کی آرزو وہ اکثر کیا کرتا تھا۔ وہ خواب سے اشارہ پا کر واپس آتا ہے اور میاں بیوی مل کر بلا تفریق و مذہب لوگوں کو طاعون سے بچاتے ہیں۔ یہ پس نوآبادیاتی ہندوستان کی کہانی ہے جس میں مسلمانوں کو مقامی ہندوؤں کے ساتھ اپنے سماجی و ثقافتی رشتوں کو طے کرنے کا مخمصہ درپیش ہے۔ انتظار حسین (۱۹۲۵ء-۲۰۱۶ء) نے ناول بستی (۱۹۸۰ء) میں طاعون کو ہندوؤں اور ہیضے کو مسلمانوں کی بیماری کہا۔ حسن منظر (پ:۱۹۳۴ء) کے ناول وبا (۲۰۰۸ء) میں چیچک کی وبا کو موضوع بنایا گیا ہے۔ کہانی کے واقعات ۱۹۶۰ء کی دہائی میں ایک پاکستانی ہسپتال میں رونما ہوتے دکھائے گئے ہیں۔ اس ناول میں بھی وبا استعاراتی مفہوم کی حامل ہے۔ ناول میں دکھایا گیا ہے کہ کس طرح چیچک کی وبا، لوگوں کے بیماری سے متعلق توہمات، اندیشوں، الجھاووں کو منکشف کرنے کا ذریعہ بنتی ہے۔ مجموعی طور پر ادب میں وباؤں کی نمائندگی محض ایک وقتی مہلک بیماری کے طور پر نہیں ہوئی، بلکہ وبائیں ایسا ''عرصہ'' (site) بنی ہیں جہاں سماج کی معاصر سیاسی، مذہبی، قومی اور نفسی صورتِ حال نے اپنا اظہار کیا ہے۔ فکشن نگار کا تخیل خاص طور پر وباؤں کے ذریعے بنیادی انسانی صورتِ حال کو سامنے لانے میں کوشاں رہا ہے۔

یہ معروضات پیش کرنے کا مقصد وبا اور ادب کے تعلق کا تاریخی جائزہ پیش کرنا تھا، جو یقیناً نہایت مختصر اور نامکمل ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مابعد وبا کا اردو ادب، وبا کے انھی تناظرات کو دہراتا ہے یا اکیسویں صدی کی اس نئی نوآبادیاتی دنیا کے ضمن میں کچھ نئے آفاق کی جستجو کرتا ہے؟

زیرِ نظر شمارے میں اردو زبان و ادب کے کئی اہم موضوعات پر مقالات شامل ہیں۔ امیر مینائی (۱۸۲۹ء-۱۹۰۰ء) کا ایک نایاب قصیدہ مع متن و تعارف اور اقبال نامہ سعادت آیات، خالص تحقیقی مقالات ہیں۔ اردو رسم الخط کے منبع پر مقالہ بھی تحقیقی نوعیت کا ہے۔ غالب اور مجید امجد (۱۹۱۴ء-۱۹۷۴ء) کے مطالعات، ان کی شاعری کے اہم مگر کم زیرِ بحث آنے والے پہلوؤں سے متعلق ہیں۔ ایران سے متعلق معاصر اردو سفرناموں میں ایرانی تہذیب کی ترجمانی کا جائزہ وفا یزداں منش نے لیا ہے جو اردو کی ایرانی استاد اور مصنفہ ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں سے اردو میں مابعد جدیدیت پر خاصا لکھا گیا ہے، اور مختلف زاویوں سے۔ زیرِ نظر شمارے میں رین ستال (Rein Staal) کے مضمون ''مابعد جدیدیت کی بھولی بسری کہانی'' کا اردو ترجمہ، دراصل مابعد جدیدیت کا دینی تناظر میں جائزہ ہے۔ امید ہے اہلِ علم اس میں پیش کیے گئے مؤقف پر بحث کریں گے۔ اردو میں ابہام اور کثرتِ معنی کے تصورات، ادب کے طلبا ہی کے لیے نہیں اساتذہ اور اکثر نقادوں کے لیے بھی

پریشان کن ہیں۔ انھیں راشد سعیدی نے واضح کرنے میں تنقیدی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ ڈاکٹر اورنگ زیب نیازی نے اپنے مقالے میں موجودہ وبا کے زیر اثر لکھے گئے اردو فکشن کا عمدہ تنقیدی مطالعہ کیا ہے۔ امید ہے اس موضوع پر آئندہ مطالعات میں یہ حوالے کا کام دے گا۔

سعادت حسن منٹو (۱۹۱۲ء-۱۹۵۵ء) اور فرانز فینون (Frantz Fanon۔۱۹۲۵ء-۱۹۶۱ء) پر مقالات بنیاد کے قارئین کی خصوصی توجہ چاہتے ہیں۔ اختر احسن (۱۹۳۳ء-۲۰۱۸ء) اردو کی نئی شاعری کی تحریک کے اہم شاعر تھے، جن کی زین غزلوں کا مجموعہ بھی شایع ہوا، مگر پھر وہ نفسیات کی طرف چلے گئے ۔ انھوں نے Eidetic Image کے نام سے ایک جدا قسم کا نفسی علاج کا طریقہ اختیار کیا، جس کی جڑیں مشرق میں، خصوصاً بودھی نظریات میں ملتی ہیں۔ وہ مغرب کے زبان اساس تحلیل نفسی کے مخالف تھے۔ انھوں نے منٹو کے متنازع سمجھے جانے والے افسانے ''دھواں'' کا نفسیاتی تجزیہ اپنے مخصوص مشرقی نفسیاتی تصورات کی روشنی میں کیا ہے۔ اس تجزیے میں انھوں نے ایک طرح سے مغربی نفسیاتی مطالعات کی ردّ تشکیل کی ہے۔ ہمیں یہ کہنے میں ہرگز باک نہیں کہ نہ صرف منٹو شناسی میں یہ ایک اہم ترین مضمون ہے بلکہ نفسیاتی مطالعات میں بھی اور اسے ہم اعتماد کے ساتھ فرائیڈ (Sigmund Freud۔۱۸۵۶ء-۱۹۳۹ء) کے دستوفسکی (Fyodor Dostoevsky۔۱۸۲۱ء-۱۸۸۱ء) پر مضمون کے مقابل رکھ سکتے ہیں۔ ہم اس کا متن پہلی بار بنیاد میں شایع کرنے کا اعزاز حاصل کر رہے ہیں۔ حنا جمشید نے اس کی تدوین کی ہے۔

فرانز فینون کا انتقال ساٹھ برس پہلے (۱۹۶۱ء میں) ہوا تھا۔ ڈاکٹر اختر علی سید نے ان کے پس نوآبادیاتی نظریات کا جائزہ، آج کے تناظر میں لیا ہے۔ اردو دنیا افتادگان خاک کے ترجمے کے بعد فینون سے اچھی طرح واقف چلی آتی ہے۔ مختلف اردو تحریروں میں ان کی اِس اور دیگر کتب کے حوالے بھی آتے ہیں اور جستہ جستہ مضامین بھی لکھے گئے ہیں مگر فینون کے مجموعی کام پر اردو میں یہ پہلی اہم اور مفصل تحریر ہے۔ اس میں فینون کی تحریروں اور تصورات کا بہ یک وقت تاریخی و ارتقائی اور علمیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ فینون کے تصورات کی تشکیل کیسے ہوئی؟ کہاں وہ مغرب سے استفادہ کرتا ہے اور کہاں اختلاف کرتا ہے؟ آج فینون کے تصورات کی معنویت خود ہمارے لیے، ہماری اپنی صورتِ حال اور ہمارے ادب کی تفہیم کے لیے کیا ہے؟ ان سوالوں کے جوابات آپ کو اس مقالے میں ملیں گے۔ اختر علی سید نے فینون کے ردّاستعماری مطالعات کے نفسیاتی تناظر کو بہ طور خاص اجاگر کیا ہے۔ فینون کی مانند خود اختر علی سید نفسیاتی معالج ہیں، اس لیے وہ استعماریت کے مرض کی تشخیص، اسباب، اثرات اور مضمرات کو سمجھنے میں نفسیات کی اہمیت کا راست علم رکھتے ہیں۔

ردّاستعماریت کے دو رخ ہیں: خارجی اور داخلی۔ خارجی رخ میں سیاسی، انتظامی، آئینی، تعلیمی اداروں سے استعماری اثرات کا خاتمہ شامل ہے، اور اس کے لیے سیاسی ارادے کی ضرورت ہوتی ہے، جب کہ داخلی رخ، نفسیاتی ہے۔ ذہنی استعماریت کا خاتمہ آسان نہیں۔ اس کے لیے آدمی کو اپنی ذہنی دنیا کو نئے سرے سے تشکیل دینا ہوتا ہے، جو ایک طرف تاریخ، تعلیمی نظام، زبان، ادب کے مطالعے اور دوسری طرف خود اپنی ذہنی وجذباتی ترجیحات واقدار کے تجزیے پر منحصر ہے۔ داخلی ردّاستعماریت کے بغیر خارجی ردّ استعماریت ممکن نہیں۔ یہ مقالہ ہمیں اس جیسے کئی نکات تک پہنچنے اور غور کرنے میں مدد دیتا ہے۔

اس شمارے سے ہم مقالات کی کتابیات کو اردو کے ساتھ ساتھ رومن میں بھی شامل کر رہے ہیں، تاکہ اشاریہ سازی میں آسانی ہو۔ نیز انٹرنیٹ کے سرچ انجن کے ذریعے ان تک رسائی سریع اور آسان ہو جائے۔

کووڈ-۱۹ کی وبا میں ہم سے مزید اہل علم سدا کے لیے بچھڑ گئے۔ ان میں شمس الرحمٰن فاروقی (۱۹۳۵ء-۲۰۲۰ء) اور شمیم حنفی (۱۹۳۹ء-۲۰۲۱ء) جیسے ممتاز نقاد بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں شخصیات بنیاد کی مجلس مشاورت کا حصہ تھیں۔ ان کے علاوہ زاہد ڈار (۱۹۳۶ء-۲۰۲۱ء)، مسعود مفتی (۱۹۳۴ء-۲۰۲۰ء)، رشید امجد (۱۹۴۰ء-۲۰۲۱ء)، قاضی جاوید (۱۹۴۶ء-۲۰۲۰ء)، نصیر ترابی (۱۹۴۵ء-۲۰۲۱ء)، مشرف عالم ذوقی (۱۹۶۲ء-۲۰۲۱ء)، پروفیسر مولا بخش (۱۹۶۳ء-۲۰۲۱ء) ہم سے رخصت ہوئے۔ ہم ان سب کے اہل خانہ سے دلی تعزیت کرتے ہیں۔

ناصر عباس نیّر

۲۰ جون ۲۰۲۱ء